بنیادی حقوق کا فلسفہ اور اس کا اسلامی تناظر

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

استاذ، گورنمنٹ ڈگری کالج، ٹاؤن شپ، لاہور

جدید جمہوری نظام میں، حکومت وسیاست کا یہ طرۂ امتیاز بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے انسانی معاشروں کو آزادی و مساوات کا تحفہ اور بنیادی حقوق کا تحفظ حاصل ہوا ہے۔ اور یہ کہ معاشرے میں فرد کی اہمیت اور اس کے حقوق کی نگہداشت کی ضمانت جمہوریت میں ہی ملتی ہے۔ جدید ماہرین سیاسیات میں ایک معتبر نام ایچ جے لاسکی (H. J. Laski) کا ہے۔ جمہوریت کے درج بالا دعوے کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

Democracy rests on a belief in the fundamenal dignity and importance of the individual , in the essential equality of human beings, and in the need for freedom.(1)

اس سے معلوم یہ ہوا کہ موجودہ جمہوریت کی بنیاد فرد کی اہمیت وعظمت پر ہے۔اور کسی حکومت کے لیے آج کے دور میں یہ اقدار ایک آزمائشی پیمانہ Test Case اور Touch Stone کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہیں اصول واقدار کی پاسداری اور ان کو عروج تک پہنچانے کی صورت میں کوئی حکومت مثالی حکومت بن سکتی ہے۔

میخائل سٹیورٹ (Michael Stewart) اس فلسفے کی عملی تشریح یوں کرتا ہے:۔

When people claim that their country is a democracy We understand them to say that, as for as is humanly possible, all the adult citizens have an equal opportunity to exercise political power.(2)

یعنی اس کے خیال میں تمام شہریوں کو عملاً سیاسی (حق کے استعمال کی) قوت، یکساں اور مساوی طور پر حاصل ہو، تو جمہوریت روبہ عمل ہوگی، وگرنہ نہیں۔ فلسفہ جمہوریت کی اس روح کا فکری پس منظر کیا ہے؟ سالٹاؤ (Soltau) نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

> At the foundation lies a spiritual concept, that all men are equally children of god and there by equal in their needs and their rights.

حقوق اور ضروریات کی مساوات میں فرد کی آزادی کا راز پنہاں ہے۔ اس کے خیال میں ریاست کا کام صرف ان حقوق کا تحفظ ہے۔ اس معیار کے مطابق جس طرح کہ لوگ خود چاہیں۔ لہٰذا وہ لکھتا ہے کہ:

> The state is only there to give individuals their fullest, opportunity of living a good life, they, not the state being the judge of what 'goodness is for them. And finally authority cannot come from above or from outside; its only source is the people themselves; its only justification is its derivation from popular authority.(3)

سیاسی ماہرین کی درج بالا آراء سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمہوری ریاست میں افراد کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ آزادی اور مساوات کی بنیادوں پر مہیا ہوتا ہے۔ فرد کی اہمیت وعظمت کو معیار بنا کر تمام لوگوں کو آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے حقوق مساوی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حقوق کے تعین اور ان کے حصول کے لئے سیاسی حاکمیت میں شرکت کے یکساں مواقع سے بھی فیضیاب ہوتے ہیں۔

ذیل میں بنیادی حقوق انسانی کے اس فلسفے کا محاکمہ، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے گا، مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آزادی اور مساوات کے تصورات کا تجزیہ کیا جائے۔

جمہوری فکر کے مطابق آزادی یہ ہے کہ آدمی اپنی مرضی کا مالک ہو، اپنی قسمت اور مستقبل کا معمار اور اپنی خواہشات پورا کرنے کا حق رکھتا ہو اور اس حق میں سب برابر ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اپنی مرضی کے مطابق چلنا اور اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گذارنا، واقعی آزادی ہے؟ .... بنظر عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ بات منطقی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے تابع ہو کر رہنا، آزادی نہیں

درحقیقت اپنی خواہشات کی غلامی ہے۔ ایسے آزاد بندوں کا معاشرہ جو اپنے مرضی اور خواہش کے بندے ہوں، دراصل غلاموں کا معاشرہ ہوتا ہے۔

یہی الجھن ہے جس کی بنیاد پر خود مغرب کا مفکر پریشان ہوجاتا ہے:۔

Freedom is difficult to discuss .... Perhaps the best way of giving shape to freedom is by distinguishing it from 'Unfreedom'.(4)

الجھن یہ ہے کہ جب حقوق کے لحاظ سے برابری کا عمل شروع ہو تو ایک فرد کے حقوق کی آزادی دوسرے فرد کے حقوق کی بندش کی ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایک کی آزادی، دوسرے کو مجبوری کی غلامی تک دھکیل سکتی ہے!۔

In this sense, freedom is a zero- sum game: When one person, an employer, gains more freedom, someone else, an employee, loses it.(5)

یہی وجہ ہے کہ خود مغرب میں یہ تصوراتی الجھن، میدان عمل میں، محض تصوراتی حقیقت بن کے رہ جاتی ہے:۔

Equality of opportunity points towards an inegalititarian ideal....(6)

اسی طرح مطلق مساوات میں بڑا ابہام ہے۔ مساوات کس لحاظ سے؟ حجم یا اہمیت **(Size or Value)** کے لحاظ سے، حالات کی یا صلاحیتوں کی مساوات، مقاصد کی یا کامیابیوں کی؟

Equality is a highly complex concept, there being as many forms of equality as there are ways of comparing the condition of human existence.(7)

تصورات چونکہ ایک دوسرے میں ناقابل تفریق حد تک مدغم ہوجاتے ہیں لہذا ان کی تشریح، تحدید اور تعریف ناممکن ہوجاتی ہے۔ جس طرح ڈکسن **(Dixon)** کہتا ہے:۔

Abstract concepts have overlapping boundories and are sometimes ambiguous and relatively indeterminate.(8)

پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کی آزادی پر سے ساری پابندیاں ہٹاتے جائیں تو دوسروں کے کئی دوسرے حقوق پر پردے پڑتے جاتے ہیں۔ معاشی آزادی اسی طرح کی ایک الجھن ہے

،کہ دولتمند اور غربت کے مارے کو اگر ایک جیسی آزادی دی جائے تو نتیجہ کیا ہو گا؟

...since advocates of that particular doctrine suppress, or , at least, fail to notice, the hidden 'unfreedoms' which are associated with it.(9)

گویا آزادی ومساوات اور بنیادی انسانی حقوق کا جو تصور جمہوری فکر میں دیا گیا ہے اس سے بعض انفرادی مسائل تو حل ہو جاتے ہیں،مگر ساتھ ہی بہت سے اجتماعی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔اس لحاظ سے اسلامی اصول سیاست سے یہ جمہوری اقدار متضاد اور مخالف رخ اختیار کر لیتی ہیں ۔مثال کے طور پر مساوات کے اصول کے تحت جمہوریت نے مرد اور عورت کو ایک میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ اسلامی تعلیمات نے دونوں کے الگ دائرہ کار ، الگ صلاحیتوں اور الگ جسمانی اور نفسیاتی کیفیات کی بنیاد پر ان کے الگ الگ حقوق اور فرائض کی تفصیلات دی ہیں ۔جن حوالوں سے دونوں یکساں ہیں وہاں ان کے درمیان مساوات بیان کی گئی ہے(مثلاً اعمال کے بدلے اور جزاء کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں) ۔ اسی طرح جہاں وہ غیر مساوی ہیں وہاں الگ الگ حقوق وفرائض بیان کیے گئے ہیں (عائلی اور معاشرتی زندگی اس کی مثال ہے)۔

اسلام میں انسان ان معنوں میں آزاد نہیں ہے جن معنوں میں مغربی جمہوریت اسے آزاد قرار دیتی ہے۔

قرآن مجید نے آزاد آدمی کے لئے ''حرٌ'' اور غلام کے لئے ''عبدٌ'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قانونِ قصاص کے بیان میں ارشاد ہوتا ہے:

''﴿يَاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ط اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ.........﴾(البقرۃ:178)

امام راغب اصفہانی کے مطابق : الحر، العبد کی ضد ہے۔یعنی ایسا انسان جو کسی اور کی غلامی میں نہ ہو(10)۔ اس مفہوم کے تحت غلامی سے آزادی تک عمل کے لئے قرآن پاک نے'' تحریر رقبہ '' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (النساء:92)..........ایک لطیف نقطہ یہ ہے کہ اسی لفظ حر کے مادے سے ترکیب پانے والا لفظ'' محررا'' قرآن مجید میں ایک اور معنی میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

''﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ......﴾ (آل عمران:35)یہاں محرراً کا لفظ مفسرین اور اہل لغت کے نزدیک وقف شدہ، خادم معبد اور مخلص تابع فرمان انسان کے لئے استعمال ہوا ہے۔(11) گویا قرآن وسنت کے بیان کردہ فکری وعملی اصولوں کے مطابق انسان آزاد بھی ہے اور غلام بھی۔آزاد ان معنوں میں کہ وہ کسی انسان یا دیگر ہستی کا غلام نہیں مگر وہ غلام ان معنوں میں اپنے رب کا عبد ہے:۔

﴿وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنِo﴾(الذاریات:56)

اسی طرح کا معاملہ مساوات کے ساتھ بھی ہے۔انسان کچھ حوالوں سے برابر ہے جیسے تخلیق، انسانیت، تکریم وغیرہ ۔اسی طرح کچھ حوالوں سے غیر مساوی ہے جیسے درجات، اہلیت، علم ،رزق وغیرہ ۔خود مرد وعورت ہی کی مثال کو لیجئے ،قرآن فرماتا ہے:۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط﴾(البقرۃ:228)

بیسویں صدی میں جدید افکار کے انقلاب سے پہلے، فطری حقوق **(Natural Rights)** کے نام سے مذہب عیسائیت کے منظم کردہ حقوق کا ایک سلسلہ موجود تھا۔ مذہبی تفوق کو جوں جوں زوال ہوا، تبھی توں ان ''فطری حقوق'' کی مذہبی اور اخلاقی حیثیت تبدیل ہوتی گئی:

By the twentieth century, the decline of religious belief had led to the secularisation of natural right theories , which were reborn in the form of 'human' rights(12)

انسانی حقوق کی اس تحریک کے پیچھے بنیادی طور پر نشاۃ ثانیہ کے اس تصور کو دخل تھا، جس کے تحت زندگی کے تمام معاملات کو صرف انسانی سطح پہ پرکھنے کی سوچ پروان چڑھی۔ بیسویں صدی میں ان حقوق کی درج ذیل تعریف کی گئی۔

Human rights are rights to which people are entitled by virtue of being human.They are therefore,'Universal' rights in the sense that they belong to all human beings.... Human rights are also fundamental' rights in that they are inalienable, they can not be traded away or revoked.(13)

بنیادی انسانیحقوق کی یہ سادہ سی تعریف ہے۔اس کی تشریح میں بہت وسعت آئی ہے اور خود

مغرب میں اس پر بہت بحث کی گئی ہے۔ جو کہ بنیادی حقوق کے دائروں پر سے قدرتی اور مذہبی اصولوں کو ہٹانے سے متعلق ہے اور خود اس اصطلاح کے اطلاق اور تعین سے منسلک ہے۔ اگر انسانی حقوق کے اس تصور کو سامنے رکھا جائے جو انہیں...... بنیادی،...... عالمگیر...... اور مطلق...... حقوق قرار دیتا ہے، تو کئی سوال ایسے جنم لیتے ہیں جن کا جواب انسانی بصیرت کے بس میں معلوم نہیں ہوتا۔

مطلق بنیادی حقوق انسانی کے بارے میں سب سے پہلے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ حقوق انسان کو انسان ہونے کی بنیاد پر حاصل ہوتے ہیں یا محض زندہ ہونے کی بنیاد پر؟ یعنی یہ کہ ان حقوق کی بنیاد زندگی ہے یا انسانیت؟

اگر ان کی بنیاد زندگی ہے تو پھر یہ حقوق ساری زندہ چیزوں کے ہونے چاہئیں۔ جیسا کہ ٹوم ریگن (Tom Regan) نے اپنی کتاب The Case For Animal Rights میں لکھا تھا کہ:۔

...all creatures that are the subject of life qualify for rights.(14)

اور اسی بنیاد پر مغرب میں حیوانوں کے حقوق کی تحریک جاری ہے۔

لیکن الجھن یہ ہے کہ حقوق کو مطلق Absolute اور بنیادی Fundamental مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر زندگی حقوق کی بنیاد بنتی ہے تو پھر سب زندہ چیزوں کو حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ پھر اگر سب کی زندگی ایک جیسی ہے تو سب کے حقوق ایک طرح ہوں۔ اگر زندگی مختلف ہے تو حقوق مختلف ہونگے۔ چونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ زندگی کئی قسم کی ہے تو حقوق بھی کئی قسم کے اور مختلف ہونے چاہئیں۔ یعنی حقوق کی مساوات چہ معنی؟...... اگر مختلف ہونا ضروری ہے تو ان مختلف حقوق کا تعین کون کرے گا؟ خود ابھی زندہ چیزوں کی درجہ بندی مکمل نہیں ہوئی تو حقوق کی درجہ بندی کیسے ہوگی۔ اور اگر یہ درجہ بندی ہوگئی تو یہ مطلق کیسے رہ جائیں گے؟ اور اگر تعین ہو گیا تو زمینی زندگی کے بارے میں ہوگا یا آبی مخلوق کے بارے میں؟ اور فضائی مخلوق کا کیا بنے گا؟ زمینی مخلوق کو لے لیں۔ اس میں سے بھی گھریلو پالتو جانور سے شروع کرتے ہیں لیکن اگر کتے کے حقوق کا تعین ہو گیا تو ان جانوروں کے حقوق کا کیا ہوگا جن کا گوشت کتے کو پیش کیا جاتا ہے؟

اگر ان حقوق کو صرف مویشیوں اور پالتو جانوروں تک محدود کر لیا جائے (بامر مجبوری) تو پھر یہ

سوال پیدا ہو جائے گا کہ ان حقوق کا تعلق پھر خاص مقام رکھنے والی، زندہ چیزوں سے وابستہ ہو گیا اور اس طرح یہ عالمگیر، بنیادی اور مطلق نہیں رہیں گے۔ پھر جن مخصوص زندہ چیزوں کو یہ حقوق دیئے جائیں گے ان میں بھی مساوات اور برابری ایک سوالِ لاجواب بن جائے گی۔ مثلاً انسان کے لیے عبادت کا اظہار خیال کا اور حصول تعلیم کا حق ہوتا ہے۔ کیا جانوروں کو بھی ایسے ہی حقوق حاصل ہونگے؟

یہ الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ جب خود انسان کو بھی جانوروں کی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ جانور Social ہوتے ہیں اور انسان بھی، انسان سماجی حیوان تو تھا ہی اب وہ سیاسی حیوان بھی ہے اور اس پر جدید انسان کو اصرار بھی ہے جیسا کہ لیوراؤک (Leo Rouch) اپنی مشہور کتاب ،سیاسی حیوان میں لکھتا ہے:۔

Our nature is inevitably social,and so, "poltitcal animal " defines us as we are and must be (15)

ایسی صورتحال میں انسان سمیت تمام جانوروں کے حقوق کی تعین کا مسئلہ بہت گنجلک ہو جاتا ہے مثال کے طور پر زندہ رہنے کے حق کو لیجیے۔انسان کو قتل کرنے والے انسان کو بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اس بنیاد پر قتل کی سزا ختم کر دی جانی چاہیے۔ اگر اس لیے نہیں ختم کیجا سکتی کہ اس نے بھی خود مقتول کا حق تلف کیا ہے تو پھر یہ اصول اب انسان پر، دیگر جانوروں کے تناظر میں لاگو کریں تو انسان کئی جانوروں کو اپنے مقاصد اور ضروریات کے تحت قتل کرتا یا مارتا رہتا ہے۔......اور یہ ایسا ''جرم'' بنتا ہے جس سے کرہ ارض کا کوئی انسان مبرا نہیں ہے۔تو کیا پھر تمام انسان قتل کر دیئے جائیں؟..........اگر زندہ رہنے کے حق کے علاوہ دیگر حقوق برابری کی سطح پر تمام جانوروں کے لیے مہیا کرتے ہوں تو وہی الجھن برقرار رہتی ہے کہ مچھر کے مقابلے میں انسان کے، اور انسان کے مقابلے میں مکھی کے حقوق کا تعین کیسے ہوگا؟........

یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک قاتل کو سزا دی جا سکتی ہے اسی طرح ایسے جانور کو مارا جا سکتا ہے جو نقصان دہ ہو اور اس طرح (مثلاً) تمام جراثیم کش ادویات کا استعمال درست قرار پا جائے گا۔ لیکن ان کے استعمال سے گناہ گار اور بے گناہ کو ایک جیسی سزا دینے کا قصور کس کے سر جائے گا اور بے گناہوں کی زندگی لینے کا ''حق'' استعمال کرنے والے کی سزا کیا ہوگی؟ پھر یہ تعین کیسے ممکن ہو گا کہ دوسرا

جانور ''نقصان دہ'' ہونے کے دائرے میں کب داخل ہوا؟ (کہ اس کو مارنے کا جواز پیدا ہو!) اور یہ کہ کس حد تک نقصان دہ ہونے کی سزا کے طور پر اس سے زندگی کا حق چھینا جاسکتا ہے؟ اس طرح کے منفرد اور ناممکن پیمانے کون ایجاد کرے گا کہ ایک بھونکتا ہوا کتا، کس لمحے کاٹنے کا اردہ مکمل کر کے حملہ آور ہوا؟ اور خود کاٹے جانے والے کے حقوق کی خلاف ورزی، کہاں کہاں سے ہوئی؟......... یہ تو سارے سوال اس صورت میں ہیں جب آپ نے انسان کو ایک جانور مانا اور دیگر جانوروں کی طرح اس کے حقوق کا مسئلہ درپیش ہو......... سوالوں کا ایک اور سلسلہ وہ ہے جو انسان کو انسان مان لینے کے بعد اس کے حقوق کی تعیین کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔

یعنی یہ کہ ایک انسان کب 'Human' کہلانے کا مستحق بنتا ہے جب کہ وہ ہیومین رائٹس کا مستحق ہوسکے؟ پیدائش سے پہلے یا پیدائش کے بعد!

اگر پیدائش سے پہلے ہی وہ حقوق کا حق دار ہو جاتا ہے اور ہر زندہ جسم کو ان حقوق کا مستحق مانا جائے تو اسقاط حمل (Abortion) کے ''حقوق'' کی کیا حیثیت ہے؟......... اگر پیدائش کے بعد ہیومین کہلاسکتا ہے تو اسقاط حمل کو جائز قرار دینے کے لیے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ بچہ پیدا ہونے سے، پہلے مردہ ہوتا ہے یا یہ ماننا پڑے گا کہ زندگی مقدس نہیں ہے اور حقوق کا تعین صرف زندگی کے ساتھ نہیں ہوتا ،زیادہ دیر کی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے ماں کی زندگی زیادہ قیمتی ہے یا یوں کہنا پڑے گا کہ جو دنیا میں پہلے آیا ہوا ہے، اسے بچانا حقوق کے دائرے میں داخل ہے اور اس کی آزادی زیادہ مقدم ہے بہ نسبت اس کے جس نے ابھی یہ ''زندگی'' شروع ہی نہیں کی!!!

یہ الجھن یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے دوبارہ شروع ہو جاتی ہے کہ آیا حقوق کا تعلق بلوغت اور شعور کے ساتھ ہے یا ہر پیدا ہو جانے والے انسان کے حقوق اس کی زندگی کے پہلے دن سے ہی شروع ہو جاتے ہیں؟.........

اگر پیدائش سے ہی حقوق شروع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ تمام حقوق بھی ہر بچے کو شروع سے دینا پڑیں گے جن کو بلوغت کے بعد مانا جاتا ہے مثلاً الگ رہنے کا حق ،شادی کا حق وغیرہ ۔۔اگر بچے کے اپنے حقوق ہیں اور بالغ کے اپنے ،تو ان حقوق کے مطلق اور آفاقی ہونے کی تھیوری غلط ہو گئی اور حقوق کا تعلق شعور سے وابستہ ہو گیا۔ اس لیے کہ بچہ اپنے حقوق کا تعین خود نہیں کر سکتا۔ کسی باشعور کو یہ تعین کر کے

دینا ہوگا۔یوں اگر حقوق کی تعیین کی بنیاد، شعور اور بلوغت کو بنایا جائے گا تو پاگلوں کے حقوق کا کیا بنے گا؟............

اس کے ساتھ ان حقوق کی جنس کے لحاظ سے تخصیص کا سوال بھی موجود ہے۔آیا یہ حقوق مردوں کے لیے عالمگیر اور مطلق ہیں یا ایسے ہی عورتوں کے بھی حقوق ہیں؟ اگر عورت اور مرد برابر ہیں تو ایک جیسے حقوق ہونے چاہییں ۔یعنی اگر عورتوں کو میٹرنٹی لیو ملتی ہے تو مردوں کو بھی ملنی چاہیے ۔یا دوسرے لفظوں میں مردوں کو نہیں ملتی تو عورتوں کو بھی نہیں ملنی چاہیے۔اگر یہ کہا جائے کہ مردوں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مرد اور عورت برابر نہیں ہیں (ضرورت اور تقاضوں کے لحاظ سے) یا پھر یہ کہ حقوق ایک جیسے نہیں ہو سکتے ! اگر اول الذکر حقیقت کو تسلیم کر لیں تو بہت ساری فلاسفی بے ثبات ہو جائے گی اور اگر تو مؤخر الذکر کو تسلیم کر لیں تو بنیادی حقوق کا فلسفہ تبدیل کرنا پڑ جائے گا؟؟؟

یہ اور اسی طرح کی اور الجھنیں ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے ۔اس کا سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ حقوق وفرائض کا وہ پیمانہ مان لیں اور اس کی ادائیگی کی فکر شروع کر دیں جو خالق کائنات نے خود بالوضاحت وحی کے ذریعے ہم تک پہنچادیا ہے اور اپنے نبیوں کے ذریعے اس کی عملی تصویر دکھادی ہے انصاف کے قریب ترین پہنچ جانے کا یہی ایک راستہ ہے۔انسانوں کو انصاف تک پہنچانے کے لیے اور انسانوں کے ان معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے جن میں وہ اختلافات اور الجھنوں کا شکار رہتا ہے، نبی بھیجے گئے ہیں:۔

﴿وَاَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ؕ﴾۔(البقرۃ:213)

اللہ کی آخری کتاب اور آخری نبی کے بیان کردہ حقائق کے مطابق کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے جو تمام چیزوں کی تخلیق اور تقدیر کے فیصلے کرتا ہے:۔

﴿وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيراً﴾(الفرقان:2)

وہ حقوق کی تعیین اور بہم رسانی کا اہتمام بھی کرتا ہے اور وہی کر سکتا ہے (جو انسان کے بس میں نہیں !)

﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰىo وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰىo﴾(الاعلیٰ:2،3)

وہی اس سلسلے میں ہونے والی خلاف ورزیوں کا حساب و کتاب بھی رکھ سکتا ہے اور رکھتا ہے:۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّاكَسَبُوْا ط وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِo ﴾(البقرۃ:202)

اس حوالے سے اس کے پیمانے، معیار اور طریقے اس کے اپنے ہیں اور ان کا اطلاق وہ حکمت اور انصاف سے کرنے کا اسلوب جانتا ہے:۔

﴿لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌo﴾(الشوریٰ:12)

انسان یا کوئی اور ہستی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ اس وسیع کائنات کا وہ تنہا مالک و حاکم ہے

﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ ....﴾(البقرۃ:255)

﴿وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ط﴾(فاطر:44)

ان حقائق کی روشنی میں دیگر معاملات کی طرح مذکورہ بالا مسائل کو بھی رب کائنات پہ چھوڑ دینا انسان کی ضرورت اور مجبوری ہی نہیں، ان مسائل کا صحیح حل بھی ہے اور حکمت و دانائی کا تقاضا بھی!۔

جہاں تک معاملہ ہے انسان کا اپنا، تو اس سلسلہ میں وضاحت موجود ہے کہ:

انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہونے کی بنیاد پر اختیارات اور ذمہ داریوں کا مجموعہ ہے جس کے ساتھ حقوق و فرائض کا توازن وابستہ ہے:۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ م بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَo﴾(یونس:14)

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾(الملک:2)

بنی آدم کو تکریم اللہ نے عطا کی ہے اور تمام چیزیں اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ....﴾(الاسرآء:36)

یہ تعظیم اور تسخیر، اللہ تعالیٰ کے دیئے گئے نظام کی تنفیذ اور انصاف کے حصول کی بنیادوں پر اور ان شرائط کے پورا کرنے پر انسان کو ترجیحی حقوق عطا کرتی ہے۔ انسان کو اپنی حیثیت و مقام اور اپنے انجام کو سامنے رکھ کر اپنے حقوق کا حصول اور اپنے اختیارات کا استعمال ممکن بنانا ہوگا۔ کثرت ہوس اور

ہوس کثرت سے احتراز کرتے ہوئے اعتدال کی راہ پر قائم رہنا چاہیے کہ اس کے خالق کو حد سے گذرنے والے پسند نہیں ہیں اور اس نے ایک دن تمام اختیارات اور حقوق کا حساب لینا ہے:۔

﴿ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ o﴾(التکاثر:8)

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا o﴾(الاسرآء:36)

یہ جاننے کے لئے کہ فکرِ اسلامی میں، حقوق کا تصور، ان کی بنیاد اور معیار کیا ہے، ضروری ہے کہ لفظ حق (جس کی جمع حقوق آتی ہے) کی تشریح، قرآن مجید میں آنے والے، اس لفظ کے مفاہیم کی روشنی میں کی جائے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں لفظ ''حق'' کثرت کے ساتھ، کئی معنوں میں بیان ہوا ہے (16)۔ ذیل میں ہم صاحب مفردات کی تحقیق کا خلاصہ، قرآن پاک کی آیات کے حوالوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) مطابقت، موافقت اور موزونیت:

﴿مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ج﴾ (یونس:5)

(۲) مبنی برحق تخلیق اور تخلیق کرنے والی ذات:

﴿فَذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج......﴾

(۳) گمراہی اور باطل کی ضد:

﴿......فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ o﴾(ایضاً:32)

(۴) سچ اور درست (وقوع اور عمل پذیر ہونے کے لحاظ سے)۔

﴿كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ......﴾(ایضاً:33)

(۵) لازم، ضروری اور واجب:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ ج حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ o﴾۔(ایضاً:103)

قرآن مجید کی درج بالا آیات کی روشنی میں لفظ حق کے مفہوم کے یہی وہ مختلف پہلو ہیں، جو

مفسرین کرام نے بھی بیان کیے ہیں ۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر طبری اور الکشاف)

(17) جبکہ آخری سطر میں درج مفہوم کے لحاظ سے، سیاسی زبان میں حقوق کا لفظ، ان لوازمات اور واجبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی معاشرے اور فرد کے درمیان باہم رابطہ و تعلق کی بنیاد ہوتے ہیں۔ان کا ایک حصہ ہر فرد معاشرے سے طلب کرتا ہے اور دوسرا حصہ وہ جو معاشرے کو فرد سے مطلوب ہوتا ہے۔

اس دوگونا سلسلے کو حقوق و فرائض کے دو اجزاء میں تقسیم کیا جاتا ہے جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں۔ جہاں تک حقوق و فرائض کی ادائیگی کا تعلق ہے تو فرائض ادا کرنے کی باری پہلے آتی ہے اور حقوق حاصل کرنے کی بعد میں .... دین اسلام فرائض کی بجا آوری کے ساتھ جہاں عدل و احسان (یعنی ادائیگی کی اعلیٰ ترین صورت) کی شرط لگاتا ہے وہاں مزدور کی اجرت (کا حق) اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دینے کی تاکید کرتا ہے۔اس طرح حقوق و فرائض باہم مربوط ہو جاتے ہیں۔ویسے بھی اردو زبان کی یہ ترکیب یعنی حقوق و فرائض بظاہر دو الگ چیزوں کو یکجا کرنے والی معلوم ہوتی ہے جبکہ عربی زبان میں حق اور فرض کئی معنوں میں ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں کیونکہ قرآن نے فرض اور فریضہ (جس کی جمع فرائض ہوتی ہے) کا لفظ بھی لازم، متعین، مقرر، ضروری اور واجب الاداء کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:۔

﴿وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً.........﴾ (البقرة:237)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اصول عمرانی کے لحاظ سے حقوق و فرائض ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے واجبات کو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں تقسیم کیا ہے جن کی بجا آوری کے ساتھ دنیا اور آخرت کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت فراہم کی ہے۔

دینِ اسلام، حقوق و فرائض کو نہ صرف مربوط رکھتا ہے بلکہ ان کی ترجیحات کا تعین بھی کرتا ہے۔جن معاشروں میں حقوق و فرائض کی ادائیگی میں عدم توازن در آتا ہے وہاں فتنہ و فساد ایک لازمی نتیجے کے طور پر، انسانی اجتماعیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔گویا اپنے معاشروں کی تعمیر و تخریب میں بنیادی کردار، انسان کا اپنا ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض بحسن و خوبی ادا کرتا رہے

تو دوسروں کے حقوق بطریق احسن ادا ہوتے رہتے ہیں اور بنیادی حقوق کا واویلہ نہیں مچتا۔لیکن صورتحال اس سے متضاد ہوتو پھر ظَهرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ O (الروم:41) کی عملی صورت سامنے آجاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کے حقوق وفرائض کا تعین اس کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ کسی کے مقام ومرتبہ کا تعین اس کے مقصدِ زندگی یامقصدِ وجود سے ہوتا ہے۔ یہ مقصدِ وجود یا مقصدِ تخلیق وہی متعین کرتا ہے جو خالقِ حقیقی ہے۔ خالق و مالک جب تخلیق کرتا ہے تو مقصدِ تخلیق کے ساتھ ذمہ داریوں کا بھی تعین فرماتا ہے۔ یہی ذمہ داریاں فرائض ہیں۔ ایک کے فرائض دوسرے کے حقوق اور دوسرے کے فرائض پہلے کے حقوق قرار پاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آجائے تو بے شمار مسائل حل ہوجاتے ہیں۔

جس انسانی معاشرے کے افراد میں سماجی فرائض سے غفلت برتنے کا رویہ عام ہوجائے وہاں بنیادی حقوق کے مطالبے عام ہوجاتے ہیں۔ جہاں انسان اپنے قدرتی اور فطری فرائض سے ''آزادی'' کا خوہشمند ہوجاتا ہے وہاں اس کے اپنے بنیادی حقوق کا مطالبہ بے معنی اور غیر منطقی ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اگر اس کے مفادات مکمل نہ ہوں تو وہ اجتماعیت کا دشمن بن کر فساد کا باعث بن جاتا ہے اور اگر یہ حقوق پورے ہونے لگیں تو وہ انفرادیت پسند، غیر جانبدار اور بے حس ہوجاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ معاشرتی خودکشی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ جسے کچھ مل جائے وہ بے نیاز ہوکر بے حس ہوجاتا ہے اور جسے نہ ملے وہ محروم رہ کر مایوس! دل سینہ بے نور میں محروم تسلی!

کتابیات وحوالہ جات

(1) Laski, H. J. *An Introduction To Politics*, London - 1960, p-48

(2) Michael Stewart, *Modern Forms of Government*, London - 1959, p-199

(3) Soltau, *An Introduction To Politics*, Longman, London - 1968, p-166

(4) Ortega Gasset, *The Revolt Of The Masses*, New York - 1932, p-191

(5) *Ibid:* p-199 (6) *Ibid:* p-231 (7) *Ibid:* p-145

(8) Dixon, Kieth, *Freedom And Equality*, London - 1986, p-19

(9) *Ibid:* p-29

(10) راغب اصفہانی، حسن بن محمد، المفردات، مطبعۃ خدمات چاپی مصر، طبع ثانی۔1404ھ:111

(11) سید مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔1991ء:1/247

(12) Heywood, Andrew, *Political Ideas And Concepts*, London - 1998: p-141

(13) *Ibid:* p-142 (14) *Ibid:* p-145.

(15) Leo Rouch, *Political Animal*, (Amherst - 1981)

(16) راغب اصفہانی، ایضاً:125

(17) الزمخشری، محمود بن عمر، الکشاف، مطبعۃ الاستقامۃ، مصر۔1946ء:2/344

الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، مصطفیٰ البابی، مصر۔1349ھ:2/402

الطبری، محمد ابن جریر، جامع البیان، مصطفیٰ البابی، مصر۔1968ء:10/86، 114، 11/116